زکوٰۃ کے مستحق کون ہیں؟

علمی و قلمی جہاد کی اہمیت

مولانا محمد شہاب الدین ندوی۔ ناظم فرقانیہ اکیڈمی۔ بنگلور ۵۷

(۳)

چنانچہ علامہ جصاص رازی تحریر کرتے ہیں:

"اگر یہ پوچھا جائے کہ ان دونوں جہادوں میں کونسا جہاد افضل ہے؟ آیا نفس اور مال کا جہاد یا علم کا جہاد؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ تلوار کے ذریعہ جہاد کرنا علمی جہاد پر موقوف ہے اور وہ (تلوار کا جہاد) اُس کی (علمی جہاد کی) ایک شاخ ہے۔ کیونکہ تلوار کے ذریعہ جہاد کرنے میں اُس چیز سے تجاوز کرنا جائز نہیں ہے جس کو علم نے واجب قرار دیا ہو۔ اس اعتبار سے علمی جہاد اصل ہے اور جسمانی جہاد اُس کی ایک شاخ ہے۔ اور اصل اُس کی شاخ سے زیادہ فضیلت والی ہے۔

فان قیل فأی الجهادینِ أفضلُ؟ أجهاد النفس والمال أم جهاد العلم؟ قِیل له الجهاد بالسّیفِ مبنیّ علی جهادِ العلم وفرعٌ علیه، لأنّه غیرُ جائز ان یعدوا فی جهاد السیف ما یُوجبُه العلم۔ فجهادُ العلم أصلٌ وجهاد النفس فرعٌ۔ والأصل أولی بالتفضیل من الفرع۔[۴۸]

---

[۴۸] احکام القرآن ۳/۱۱۹

یہ ایک بصیرت افروز بیان ہے جو حقائق و معارف سے بھرپور ہے۔ اور اس سے اسلام میں جہاد کی اصل حقیقت اور اُس کا فلسفہ پوری طرح کھل کر سامنے آجاتا ہے۔ اور اس سے حسب ذیل حقائق ثابت ہوتے ہیں:

۱۔ علمی جہاد اصل ہے۔

۲۔ علمی جہاد جسمانی جہاد پر حاکم ہے۔ یعنی جب تک علمی اعتبار سے جہاد کے حدود و مقاصد واضح نہیں ہو جاتے جسمانی جہاد کو آزادی کے ساتھ جاری نہیں رکھا جاسکتا۔ بالفاظِ دیگر جسمانی جہاد علمی جہاد کے تابع رہے گا اور جب تک علم یہ اعلان نہ کردے کہ جہاد (جسمانی) کن حالات میں ضروری ہے اور کن حالات میں ضروری نہیں ہے، وہ اپنے طور پر کچھ نہیں کرسکتا۔

۳۔ اس اعتبار سے علم ہر حال میں افضل ہے۔

جہادِ علمی کا ایک تاریخی ثبوت

نیز اس موقع پر ایک اور بہت بڑی اور تاریخی حقیقت یہ بھی ثابت ہوتی ہے کہ چونکہ جصاص رازی چوتھی صدی ہجری کے عالم اور فقہ حنفی کے ایک زبردست فقیہہ گزرے ہیں۔ اور اُن کی اس بحث سے یہ عظیم حقیقت بھی پوری طرح واشگاف ہو جاتی ہے کہ ہمارا فقہی ذخیرہ کم از کم چوتھی صدی ہجری میں علم کے جہاد میں شامل ہونے کے تصوّر سے ناآشنا نہیں تھا۔ چنانچہ موصوف کا جہاد کی دو بنیادی قسمیں قرار دیتے ہوئے علم کو جہاد کی ایک مستقل قسم تسلیم کرنا اسی حقیقت کے اعتراف کا ایک ناقابلِ تردید تاریخی ثبوت ہے کہ دورِ قدیم ہی سے "علمی جدوجہد" بھی نہ صرف جہاد تسلیم کی گئی ہے بلکہ وہ جہاد کی اعلیٰ و ارفع شکل کے طور پر اپنا لوہا منوا چکی ہے۔ اس طرح محقق اہلِ علم کی متواتر شہادتوں سے یہ مقدمہ نہایت درجہ مضبوط ہو جاتا ہے۔ اور ان حقائق کا انکار کوئی مادرزاد اندھا بہرا شخص ہی کرسکتا ہے۔

نیز اس موقع پر یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہے کہ علامہ جصاص رازی نے اس موقع پر "جہاد العلم" کو "جہاد النفس" کے مقابلے میں بطور ایک اصطلاح استعمال کیا ہے۔ اس کا صاف مطلب

یہ ہُوا کہ چوتھی صدی ہجری میں "علمی جہاد" بطور ایک اصطلاح رائج اور مقبول ہوچکا تھا۔ جیسا کہ اس موقع پر موصوف کے اُسلوبِ کلام سے ظاہر ہوتا ہے جو سوال و جواب کی شکل میں ہے۔ اس سے بڑا تاریخی ثبوت اور کیا چاہیے؟

هٰذَا بَصَائِرُ لِلنَّاسِ۔

قَدْ جَاءَكُم بَصَائِرُ مِن رَّبِّكُمْ ۖ فَمَنْ أَبْصَرَ فَلِنَفْسِهِ ۖ وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا؛ دیکھو تمہارے رب کی جانب سے تمہارے پاس اسباق آچکے ہیں۔ تو اب جس نے بصارت سے کام لیا تو فائدہ میں رہا اور جو اندھا بنا تو وہ زیاں کار ہوا۔ (انعام: ۱۰۴)

غرض امام جصاص کی مذکورۂ بالا توجیہہ و تشریح محض یک عقلی توجیہہ نہیں بلکہ وہ قرآن اور حدیث کی صراحتوں سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ چنانچہ قرآنِ حکیم سے یہ بات ثابت ہے کہ اہلِ علم کا درجہ دیگر تمام اہلِ ایمان سے اُونچا ہے جو غیر اہلِ علم ہیں:

يَرْفَعِ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَالَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ: اللہ تم میں سے ایمان والوں کے اور اُن لوگوں کے درجے بلند کرتا ہے جن کو علم دیا گیا ہے۔ (مجادلہ: ۱۱)

حضرت ابنِ مسعودؓ سے اس آیت کی تفسیر میں مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اہلِ علم کی فضیلت بیان کی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن اہلِ ایمان پر اہلِ علم کا درجہ بلند کرتا ہے جو اہلِ علم نہیں ہیں، جب کہ وہ خدا کے حکموں پر چلیں۔[۴۹]

اور احادیثِ نبوی میں علم اور اہلِ علم کی جو فضیلت آئی ہے اُن پر مفصل تبصرہ پچھلے صفحات میں ہوچکا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دین میں علم سے بڑا مقام و مرتبہ کسی دوسری چیز کا نہیں ہے۔ کیونکہ علم ہی وہ شے ہے جس سے اچھے بُرے میں تمیز ہوتی ہے اور خدا کی مرضی اور اُس کے احکام معلوم ہوتے ہیں۔ دین کی درستی علم کی درستی پر موقوف ہے۔ اگر علم غلط ہوجائے تو پھر پورا دین اور لوگوں کے سارے

---

[۴۹] ماخوذ از تفسیر قرطبی، ۱۷/۲۹۹

اعمال غلط ہو جائیں گے۔ بلکہ خود جہاد بھی غلط ہو جائے گا۔ کیونکہ جہاد کی اصل باگ ڈور بھی علم ہی کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ لہٰذا علم کا سرچشمہ خالص اور بے آمیز ہونا چاہئے۔ اگر کسی دور میں کوئی شخص علم کے اس سرچشمے کو گدلا کرنے کی کوشش کرے یا کوئی ایسی فکری و نظریاتی تحریک چلے جو دین اور اُس کے اقدار پر اثر انداز ہو رہی ہو تو پھر ایسی حالت میں اس قسم کی تحریکوں کے خلاف علمی جنگ کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ اسی کا نام علمی جہاد ہے جو ایک " مقدس جنگ " یا ایک مقدس فریضہ کہلاتا ہے۔

علمی جنگ کی دو قسمیں

اس لحاظ سے موجودہ دور میں دو قسم کی علمی جنگ کرنا ضروری ہے۔ ایک بیرونی اور دوسری اندرونی۔ بیرونی علمی جنگ یہ ہے کہ اسلام پر باہر کی طرف سے مختلف قسم کے مادی افکار و نظریات اور لادینی اقدار کا جو سیلِ رواں آ رہا ہے انہیں روکنے اور اسلامی معاشرے کو اُن کے مضر اثرات سے بچانے کے لئے علمی جنگ خود مغرب کے "ہتھیاروں" سے لڑی جائے۔ یعنی " جیسا دیس ویسا بھیس" کے مطابق الحاد و لادینیت کا مقابلہ خود اُسی کے ہتھیاروں یعنی اُسی کے " علوم و معارف" سے کی جائے۔ کیونکہ لوہے کو لوہا ہی کاٹ سکتا ہے، لکڑی یا کوئی اور چیز کاٹ نہیں سکتی۔ جس طرح کہ توپوں اور ٹینکوں کا مقابلہ توپوں اور ٹینکوں ہی کے ذریعہ کیا جا سکتا ہے۔ اگر ہم توپ کے مقابلے میں تلوار یا نیزے لے کر چلیں تو یہ ہماری خودکشی کے برابر ہوگا۔ لہٰذا اس اعتبار سے دینِ اسلام کو غالب کرنے کے لئے آج جدید علوم کے ذریعہ اسلام کی حقانیت اور برتری ثابت کرنی ہوگی۔ اور یہ علمی جنگ خالص استدلالی میدان میں ہونی چاہئے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے تین طریقے بتائے ہیں: ایک یہ کہ دین کی دعوت حکیمانہ انداز میں دی جائے۔ دوسرے یہ کہ دلنشین خطاب کے ذریعہ لوگوں کو بلایا جائے۔ اور تیسرا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ عقلی مباحثہ کے ذریعہ دین کی برتری ثابت کی جائے۔ (نحل : ۱۲۵) یہ علمی جنگ ہمیشہ مسلمانوں کے ذمہ ایک فرضِ کفایہ کی حیثیت سے رہے گی۔ اگر تمام مسلمان اس سے غافل ہو جائیں تو پھر سب کے سب مجرم ہوں گے۔

اور دوسرا محاذ اندرونی فتنوں اور سازشوں کے خلاف ہے، جن میں خاص کر گمراہ اور بدعقیدہ فرقے آتے ہیں، جو مار آستین کی طرح خود ہماری صفوں میں گھسے ہوئے ہیں۔ اسی کا نام منافقین کے ساتھ جہاد ہے، جس کا ذکر سورۂ توبہ (آیت ۷۳) میں آیا ہے۔

علمی وعسکری جہاد کا باہمی ربط

بہرحال ان دونوں محاذوں پر علمی جنگ (جہاد) کرنا ہر دور میں فرضِ کفایہ ہے۔ اور یہ موجودہ دور کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اور اس جنگ کو ہمیشہ اور ہر حال میں جاری رہنا چاہیئے۔ جیساکہ ارشادِ رسول ہے: "جہاد اُس وقت سے برابر جاری ہے جب سے کہ اللہ نے مجھے پیغمبر بناکر بھیجا ہے، تاآنکہ میری اُمت کا آخری فرد دجال سے دو دو ہاتھ نہ کرلے"۔

بدنی جہاد تو کبھی کبھار ہی ہوتا ہے۔ مگر علمی جہاد کو ہر حال میں جاری رکھنا ضروری ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں علامہ جصّاص رازی نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے اُس سے یہ حقیقت پوری طرح بے نقاب ہوجاتی ہے اور اسلام میں ان دونوں کے مقام و مرتبے کا حال آشکارا ہوجاتا ہے۔ چنانچہ موصوف "علم کا حاصل کرنا افضل ہے یا مشرکین سے جہاد کرنا افضل؟" کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

"اس کا جواب یہ ہے کہ جب دشمنوں کی ایذا رسانی اور اُن کے حملے کا خوف ہو اور اُن کی مدافعت کرنے والا کوئی نہ ہو تو ایسی حالت میں جہاد ہر مسلمان پر فرض ہوجائے گا۔ اور ایسی حالت میں جہاد کرنا علم حاصل کرنے سے زیادہ بہتر ہوگا۔ کیونکہ جب مُسلمان دشمن کے ضرر کا شکار ہوجائیں تو اس کی تلافی ممکن نہیں ہوسکتی۔ جب کہ علم کی تلافی تمام حالات میں ممکن ہے اور اگر فرضِ جہاد کی ادائیگی کے لئے (کچھ لوگ) تیار ہوجائیں، جس کے باعث دوسروں کی جانب سے کفایت اور بے نیازی ہوجائے تو اس صورت میں جہاد کا فریضہ علم کے حصول ہی کی طرح فرضِ کفایہ کے حکم میں ہوجائے گا۔ اور ایسی حالت میں علم میں مشغول ہوجانا جہاد سے زیادہ افضل ہوگا۔ جیساکہ ہم نے مرتبۂ جہاد پر مرتبۂ علم کی وجہ ظاہر کردی ہے۔ اس اعتبار سے جہاد

کا ثبات علم کے ثبات پر موقوف ہے۔ کیونکہ جہاد علم کی ایک شاخ ہے اور اُس کا انحصار علم پر ہے"۔ ۵۰

اس اعتبار سے علم اور جہاد میں بہت بڑا اور گہرا تعلق ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے علٰحیدہ نہیں کئے جا سکتے۔ چنانچہ یہ دونوں مل کر ملّتِ اسلامیہ کے قیام و ثبات اور اس کی درستی کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ عام حالات میں دین کی تبلیغ اور اُس کی نشر و اشاعت ضروری ہے۔ مگر خاص حالات میں، جب کہ دشمن کا حملہ ہو جائے یا اُس کا خطرہ پیدا ہو جائے تو پھر اس وقت علمی جہاد کو روک کر بدنی و جسمانی جہاد کرنا ضروری ہو جاتا ہے، جب کہ تمام اہلِ اسلام کی جنگ میں شرکت ضروری ہو۔ ورنہ لڑنے والے مجاہدین اگر کافی تعداد میں موجود ہوں تو پھر علمی جد و جہد (جہاد) کو ہر حال میں جاری رکھنا ضروری ہے۔ یہ قرآن، حدیث اور ہمارے ائمہ کرام کی تعلیمات کا خلاصہ اور اُس کا نچوڑ ہے۔

حاصلِ بحث یہ کہ علمی جہاد اصل اور بدنی جہاد اُس کی ایک شاخ ہے۔ علمی جہاد کو ہر حال میں جاری رہنا چاہیئے۔ جب کہ بدنی جہاد ضرورت کے وقت ہی فرض ہوتا ہے۔ (کبھی فرضِ کفایہ اور کبھی فرضِ عین)۔ جب ہنگامی حالات پیدا ہو جائیں اور امامِ وقت کی جانب سے "نفیرِ عام" کا اعلان ہو جائے تو اُس وقت ہر مسلمان پر جہاد (عسکری) فرضِ عین ہو جاتا ہے۔ مگر اس قسم کے جہاد اور "نفیرِ عام" کا فیصلہ کرنا بھی (جصاص رازی کی تصریح کے مطابق) اہلِ علم ہی کا کام ہے۔ اس کا مطلب یہ ہُوا کہ امامِ وقت کے پاس اہلِ علم کی ایک جماعت (بطورِ شوریٰ) ہونی چاہیئے جو اُسے جہاد کے ضروری ہونے کا فتویٰ دے اور پھر امامِ وقت (مسلمانوں کا امیر) اعلانِ جہاد کرے۔ تب جا کر جسمانی جہاد حالات کی نزاکت کے لحاظ سے بعض صورتوں میں فرضِ کفایہ اور بعض صورتوں میں فرضِ عین بن جائے گا۔ حدیث اور فقہ کی کتابوں سے بطورِ اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ اعلانِ جہاد کے لئے امیر (یا خلیفہ) کا ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا جہاد کا

---

۵۰ احکام القرآن، جصاص رازی، ۳/۱۱۹

فیصلہ کرنا یا اس کا اعلان کرنا ہر شخص کا کام نہیں ہو سکتا ۔ واللہ اعلم ۔

علمی جہاد کا ثبوت قرآن سے

اس تشریح و توجیہہ سے بخوبی واضح ہوگیا کہ راقم سطور کا منشا فی سبیل اللہ کو مطلقاً عام قرار دینے کا نہیں ہے ۔ اگرچہ وہ ملک العلماء کاسانی کی تاویل کے مطابق عام ہے[۱۵] ۔ مگر اس کی عمومیت جہاد کی تاویل میں آکر مقید ہو جاتی ہے ۔ اور جہاد سے حدیثِ نبوی کی صراحت کے مطابق غزوہ و حج کے علاوہ خصوصیت کے ساتھ علمِ دین کی تعلیم و تدریس اور اس کی نشر و اشاعت مراد ہے ۔ لہٰذا فی سبیل اللہ اگر عام بھی ہو تو جہاد اُس کی تخصیص کر رہا ہے ۔ اور اس اعتبار سے زکاۃ کے آٹھ مصارف پر نہ تو کوئی اضافہ ہو رہا ہے اور نہ اس کے تحت پلوں اور سڑکوں کی تعمیر کا کوئی منصوبہ راقم سطور کے زیرِ غور ہے ، جس کی معترض " نعوذ باللہ " کی مسلسل گردان کرتے ہوئے پیہم چیخ و پکار کر رہے ہیں ۔ یہ بھی ایک استحصالی طریقہ ہے ۔ (واضح رہے کہ راقم سطور نے اپنے مضمون میں کہیں بھی پلوں اور سڑکوں کی تعمیر یا اُن کی مرمت کا ذکر نہیں کیا ہے ۔ مگر معترض کسی ایک نکتے پر تشفی بخش بحث کرنے اور علمی انداز میں جواب دینے کے بجائے بہت سی چیزوں کو گڈمڈ کر کے شور مچانے والا سا انداز اختیار کرتے ہیں ۔ تاکہ وہ عوام کو برانگیختہ کر سکیں ۔)

بہر حال راقم سطور نے اپنے کتابچے (اسلام میں زکاۃ کا نظام) میں " جہاد علمی و قلمی بھی ہو سکتا ہے " کے زیرِ عنوان جو کچھ تحریر کیا تھا وہ مذکورۂ بالا پوری بحث کا خلاصہ ہے ۔ چنانچہ اس موقع پر اسے بھی ملحوظ رکھنا چاہیئے جو مختصر اور جامع نکات پر مشتمل ہے :

" اس موقع پر یہ حقیقت بھی ملحوظ رہنی چاہیے کہ " فی سبیل اللہ " سے مراد لازمی طور پر جہاد نہیں ہے ، جیساکہ اُوپر مذکور سورۂ بقرہ کی آیت ۲۷۳ کی تفسیر سے بخوبی ظاہر ہوگیا ۔ لیکن اگر بالفرض اس سے جہاد ہی مراد لیا جائے تو یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ اس سے مراد جسمانی جہاد یعنی جنگ و جدل ہو ۔ بلکہ جہاد کی اور بھی شکلیں ہو سکتی ہیں اور ان میں سے ایک شکل علمی و قلمی جہاد

---

۱۵ ۔ تفصیل پچھلے مباحث (حصۂ اول) میں گزر چکی ہے ۔

کی بھی ہے۔ جیسا کہ خود قرآن مجید کا ارشاد ہے :

وَجَاهِدْهُمْ بِهِ جِهَادًا كَبِيرًا : اور تو قرآن کے ذریعہ کافروں سے بڑا جہاد کر۔ (فرقان : ۵۲)

اور جہاد قولی یعنی وعظ و نصیحت کے طور پر بھی ہو سکتا ہے :

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ : اے نبی تم کافروں اور منافقوں سے جہاد کرو اور اُن کے ساتھ سختی سے پیش آؤ۔ (توبہ : ۷۳)

پہلی آیت سے صاف ظاہر ہے کہ سب سے بڑا جہاد تو قرآن ہی کے ذریعہ کرنا ہے۔ یعنی قرآنی حقائق و معارف کے ذریعہ باطل قوتوں کا مقابلہ زور و شور سے کرنا ہے۔ یہی اصل جہاد ہے۔ اور دوسری آیت میں لسانی جہاد کا حکم دیا گیا ہے۔ چنانچہ مفتی محمد شفیع صاحب تحریر کرتے ہیں : "منافقین سے جہاد کا مطلب خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تعامل سے یہ ثابت ہوا کہ اُن کے ساتھ جہاد سے مراد زبانی جہاد ہے، کہ اُن کو اسلام کی حقانیت سمجھنے کی دعوت دیں تاکہ وہ اپنے دعوائے اسلام میں مخلص ہو جائیں"۔ (تفسیر معارف القرآن : ۴/۴۲۲)

لہٰذا جہاد کا مطلب لازمی طور پر تلوار اُٹھانا نہیں ہے۔ بلکہ سب سے پہلا نمبر لسانی اور علمی و قلمی جہاد کا ہے۔ اور جہاد بالسیف کا نمبر سب سے آخر میں آتا ہے، جب کہ اولین مراحل ناکام ہو جائیں۔ دعوتِ اسلام میں یہ ترتیب ہمیشہ ملحوظ رکھی گئی ہے۔ اور بعض حدیثوں کے مطابق ظالم سلطان کے سامنے حق بات کہنا افضل ترین جہاد قرار دیا گیا ہے۔ (ترمذی کتاب الفتن : ۲/۱۳۲)

اس کا مطلب یہ ہے کہ حق بات کی ترویج و اشاعت مُقدّم ہے۔ کیونکہ اتمامِ حُجّت کے لئے سب سے پہلے حق بات پہنچانا ضروری ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ جصّاص رازی حنفیؒ علمی جہاد کو اصل قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ اس سوال کے جواب میں کہ آیا نفس و مال کا جہاد افضل ہے یا علم کا جہاد؟ فرماتے ہیں کہ علم کا جہاد اصل ہے اور نفس کا جہاد فرع ہے۔ لہٰذا اصل فرع سے افضل ہے۔ (احکام القرآن : ج ۳ ص ۱۱۹)

ظاہر ہے کہ جانی و مالی جہاد کے لئے علم ہی بنیاد بنتا ہے اور علمی و فکری اعتبار سے وہی اس کے لئے راہیں ہموار کرتا ہے۔ چنانچہ کوئی بھی معرکہ سر کرنے یا ملک و ملت کے بچاؤ اور دفاع کے لئے سب سے پہلے علمی اعتبار سے جدوجہد کر کے میدان ہموار کرنا پڑتا ہے۔ گویا کہ ملت کو "حرکت" میں لانا علم کا کام ہے۔ اور اس اعتبار سے علم ہی اصل ہے اور علمی جہاد ہی کا نمبر پہلا ہونا چاہیئے۔

اس اعتبار سے "فی سبیل اللہ" سے اگر جہاد مراد لیا جائے تو اس میں علمی و قلمی جہاد بآسانی شامل ہو سکتا ہے۔ اور اس میں تاویل کرنے اور فی سبیل اللہ کے مفہوم میں وسعت پیدا کرنے کی ضرورت بھی باقی نہیں رہ جاتی۔ اور اس اعتبار سے موجودہ دور کا سب سے بڑا جہاد الحاد و لادینیت کے خلاف معرکہ آرائی ہے۔ کیونکہ آج دین و مذہب کو سب سے بڑا خطرہ جو لاحق ہے وہ الحاد و لادینیت ہی کی طرف سے ہے۔ لہٰذا آج جو علمی و اشاعتی ادارے الحاد و لادینیت اور باطل تحریکوں کے خلاف صف آراء ہیں وہ ارشادِ الٰہی (فرقان: ۵۲) کے مطابق وقت کے سب سے بڑے جہاد میں مشغول ہیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ زکاۃ کی قیمتی رقم سے ایسے اسلامی اداروں اور تنظیموں کے بازو مضبوط کئے جائیں، تاکہ وہ بے فکری اور بے جگری کے ساتھ اپنے فرائض ادا کر سکیں"۔ [۵۲]

دیکھئے اس "خلاصہ و نچوڑ" اور پچھلی تفصیلی بحث میں کسی قسم کا اختلاف یا حرف گیری کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ مگر مدعیٔ تحقیق نے بے سوچے سمجھے آسمان سر پر اٹھا لیا اور غیظ و غضب کا اظہار کرنے لگ گئے۔ گویا کہ راقم سطور نے شریعت پر ڈاکہ ڈال دیا ہو۔ معترض اگر صحیح معنی میں عالم یا محقق ہوتے یا انہیں علم و تحقیق سے ادنیٰ درجے کا بھی مس ہوتا اور مذکورۂ بالا اشاراتی حقائق کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کھلے ذہن و دماغ کے ساتھ قرآن اور حدیث کا مطالعہ کرتے تو حقائق و معارف کا ایک انبار اُن کے سامنے آ جاتا۔ مگر وہ اندھے جوش اور تعصب کے چکر میں آگئے اور ناحق پر سر باندھ کر اپنی رسوائی کا سامان خود جمع کر لیا۔ معترض اگر کچھ نہیں تو اُوپر پیش کردہ

---

[۵۲] اسلام میں زکاۃ کا نظام، از راقم سطور، ص ۲۲-۲۴، فرقانیہ اکیڈمی بنگلور

صرف سورۂ توبہ کی آیت ہی پر غور کر لیتے تو انہیں علمی جہاد کے انکار کی گنجائش بالکل نہ رہ جاتی۔ (اگرچہ سورۂ فرقان والی آیت بھی اس سلسلے میں قطعی حجت ہے)۔ اور یہ پوری آیت اس طرح ہے:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۚ وَمَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ: اے نبی تم کافروں اور منافقوں سے جہاد کرو اور اُن کے ساتھ سختی سے پیش آؤ۔ ان کا ٹھکانہ دوزخ ہے، جو بُری جگہ ہے۔ (توبہ: ۷۳، تحریم: ۹)

یہ آیتِ کریمہ اپنی اہمیت کے پیشِ نظر قرآن میں سورۂ توبہ اور سورۂ تحریم میں دو جگہ آئی ہے۔ اور اس موقع پر دو باتیں قابلِ غور ہیں: (۱) یہ آیت مدنی ہے، جب کہ جہاد (عسکری) کا اعلان ہو چکا تھا۔ (۲) مسلمانوں کو منافقین سے سابقہ مدینہ جا کر ہی پڑا، ورنہ مکّہ میں منافقین کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ تو ایسی حالت میں چند سوالات ذہن میں اُبھرتے ہیں کہ کُفّار کے ساتھ ساتھ منافقین سے بھی جہاد کرنے کا کیا مطلب ہے؟ اور پھر جہادِ عسکری کرنے کے بعد سختی کرنے کے کیا معنی ہیں؟ اگر یہاں عسکری جہاد مُراد ہے تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منافقین سے کبھی جہاد (قتال) کیا تھا یا کسی منافق کی گردن ماری تھی؟ کیا حدیث اور تاریخ سے ثابت کیا جا سکتا ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی ایک موقع پر بھی ایسا کیا ہو؟ حالانکہ خود قرآن سے ثابت ہے کہ ہادیٔ برحق (صلعم) اتنے شفیق اور مہربان تھے کہ باوجود منافقین کے بارے میں خدائے تعالیٰ کی سختی کے آپ بار بار اُن کے لئے دُعائے خیر ہی کیا کرتے تھے۔ چنانچہ اسی سورۂ توبہ میں مذکورۂ بالا آیت کے بعد تھوڑے ہی فاصلے پر مذکور ہے:

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ أَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ۚ إِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِينَ مَرَّةً فَلَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَهُمْ: تو ان کے لئے بخشش مانگ یا نہ مانگ، اگر تو ان کے لئے ستّر مرتبہ بھی بخشش کی دُعا کرے گا تو بھی اللہ انہیں ہرگز نہیں بخشے گا۔ (توبہ: ۸۰)

تو اب سوال یہ ہے کہ کیا آقائے نامدار (صلعم) نے منافقین کے ساتھ جہادِ عسکری نہ کرکے

معاذ اللہ خداوند کریم کے حکم کی خلاف ورزی کی تھی؟ معترض کو اپنی علامیت پر بڑا ناز اور غرّہ ہے۔ تو اب ذرا وہ اپنے "عسکری جہاد" والے نقطۂ نظر سے اس آیت کی تفسیر کر کے اپنے نظریہ کو درست ثابت کریں یا پھر توبہ و استغفار کرتے ہوئے اپنی بقیہ زندگی کسی گوشۂ عافیت میں گزار دیں۔ ایسے ہی موقعوں کے لئے کہا جاتا ہے:

سخن فہمی عالم بالا معلوم شد

واقعہ یہ ہے کہ جن علماء و فقہاء نے فی سبیل اللہ سے صرف جہادِ عسکری (غزوہ و قتال) مراد لیا ہے انہیں اس آیت کو سمجھنے میں سخت دشواری پیش آئی ہے۔ جیسا کہ خصوصیت کے ساتھ قاضی ابن العربی مالکیؒ (صاحب احکام القرآن) کے شش و پنج سے ظاہر ہوتا ہے۔ اور اس سلسلے میں تقریباً تمام قدیم تفسیروں کا یہی حال ہے، جنہوں نے اس کی عجیب و غریب تاویلیں کی ہیں۔ اس لحاظ سے اگر قدیم مفسرین کے فہم و دانش کو حرفِ آخر قرار دے دیا جائے تو ظاہر ہے کہ کتاب اللہ میں تفکر و تدبر کا دروازہ ہی بند ہو جائے گا۔ لہٰذا اس سلسلے میں قدیم مفسرین یا جمہور کی دہائی دے کر بلا وجہ شور و غل مچانا ایک بازاری طریقہ اور علمی اعتبار سے ایک گھٹیا حرکت ہے۔

امام رازی کی بہتر تفسیر

بہرحال میرے محدود مطالعہ کی رو سے ہمارے مفسّرین و مفکّرین میں سوائے امام رازیؒ اور امام ابن قیّمؒ کے کسی نے بھی اس آیتِ کریمہ کی صحیح تفسیر نہیں کی۔ چنانچہ امام رازی کی تحقیق کا ماحصل یہ ہے:

۱۔ یہ آیت منافقین کے ساتھ جہاد پر دلالت کر رہی ہے جو جائز نہیں ہے۔ کیونکہ منافق وہ ہے جو اپنے کفر کو دل میں چھپائے ہوئے ہو اور زبان سے اس کا انکار کر رہا ہو۔ لہٰذا اس کے ساتھ قتال کرنا جائز نہیں ہے۔

۲۔ اس سلسلے میں چند اقوال مروی ہیں، جن میں سے ایک ضحّاک کا قول یہ ہے کہ جہاد

کفار کے ساتھ کیا جائے اور منافقین کے ساتھ سختی کی جائے ۔ مگر یہ بات بعید ہے ۔ کیونکہ ارشادِ الٰہی "جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ" (کافروں اور منافقوں کے ساتھ جہاد کرو) کا تقاضا ہے کہ ان دونوں طبقوں کے ساتھ جہاد بیک وقت کیا جائے ۔ نیز اسی طرح "وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ" (ان دونوں طبقوں پر سختی کرو) کا اطلاق بھی دونوں پر ضروری ہے [۵۳]

۳ ۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چونکہ ظاہر کے مطابق فیصلہ کرنے کا حکم دیا تھا اس لئے آپ نے فرمایا کہ "ہم ظاہر کے مطابق فیصلہ کریں گے"۔ اور لوگ (منافقین) چونکہ اسلام کا اظہار اور کفر کا انکار کرتے تھے ، اس لئے اُن کے ساتھ جنگ کرنا جائز نہیں تھا ۔

۴ ۔ اور اس سلسلے میں تیسرا قول یہ ہے جو صحیح ہے کہ جہاد وسعت وطاقت خرچ کرنے کا نام ہے (بذل الجهد) اور اس لفظ میں ایسی کوئی چیز موجود نہیں ہے جو جہاد بالسیف (تلوار کے ذریعہ جہاد) یا جہاد باللسان (زبان کے ذریعہ جہاد) یا کسی اور (مخصوص) طریقے پر دلالت کرتی ہو ۔ لہٰذا ہم کہتے ہیں کہ یہ آیت دونوں فریقوں کے ساتھ وُجوبِ جہاد پر دلالت کرتی ہے ۔ مگر اس مجاہدہ کی کیفیت کیا ہو ؟ تو یہ آیت اس مسئلے میں خاموش ہے ۔ بلکہ یہ بات کسی دوسری دلیل سے معلوم کی جا سکتی ہے ۔

جب یہ بات ثابت ہوگئی تو اب ہم کہتے ہیں کہ الگ الگ دلائل کی رُو سے ثابت ہوتا ہے کہ کفار کے ساتھ مجاہدہ تلوار کے ذریعہ کرنا واجب ہے ۔ اور منافقین کے ساتھ کبھی دلیل و حُجت کے ذریعہ ، کبھی نرمی سے اور کبھی ڈانٹ ڈپٹ کر کیا جا سکتا ہے ۔

۵ ۔ اس سلسلے میں ایک قول (جو حسن بصریؒ سے منقول ہے) یہ بھی ہے کہ منافقین کے

---

۵۳ واضح رہے لفظ "عَلَيْهِمْ" کی ضمیر (هم) کافروں اور منافقوں دونوں کی طرف یکساں طور پر لوٹ رہی ہے ۔ لہٰذا جہاد کے بعد اس قسم کی سختی جہاد بالسیف کی واضح طور پر نفی ہے ۔

ساتھ جہاد کرنے کا مطلب اُن پر "حُدود" (یعنی شرعی حدیں) قائم کرنا ہے۔ مگر قاضی کا قول ہے کہ یہ کوئی چیز نہیں ہے۔ کیونکہ حد جاری کرنا ہر اُس شخص پر بھی واجب ہے جو منافق نہ ہو۔ لہٰذا اس کا تعلق "نفاق" سے نہیں ہو سکتا۔ [54]

دیکھا آپ نے یہ آیت مدنی ہونے کے باوجود جہاد کی نوعیت کے بارے میں کس طرح خاموش ہے! اور ہمارے مفسرین اس آیت کی تفسیر میں کس قدر حیران و پریشان ہیں!! تو اب مکی آیتوں کے بارے میں کس طرح دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ ان سے بھی قولی و لسانی جہاد مراد لینا صحیح نہیں ہے بلکہ جہاد کا واحد مطلب ہی جہادِ عسکری ہے؟ ورنہ پھر شریعت میں رخنہ و شگاف پیدا ہو جائے گا۔

مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ !!!

ظاہر ہے کہ اس قسم کا بے سروپا دعویٰ وہی کر سکتا ہے جو قرآن حکیم کی ابجد سے بھی واقف نہ ہو۔ مگر پھر بھی ایسے لوگوں کو دین و شریعت کے بارے میں رائے زنی کرنے اور میدانِ علم میں کود کر دوسروں کو دعوتِ مُبارزت دینے کا بڑا شوق رہتا ہے۔

ابنِ قیم کی فکر انگیز تفسیر

ذرا دیکھئے تو سہی ایک ہی آیت اور ایک ہی لفظ سے دو مختلف احکام کس طرح نکل رہے ہیں! مگر اس میں پھر بھی کچھ گرہیں باقی ہیں جو امام ابنِ قیمؒ کی تشریح و توضیح سے پوری طرح کھل جاتی ہیں۔ چنانچہ علامہ موصوف تحریر کرتے ہیں:

اللہ نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی بعثت کے ساتھ ہی (یعنی مکی زندگی کے روزِ اوّل ہی سے) جہاد کا حکم دے دیا تھا۔ چنانچہ ارشادِ باری ہے:

وَلَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِىْ كُلِّ قَرْيَةٍ نَّذِيْرًا ۔ فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا : اگر ہم چاہتے تو ہر بستی میں ایک ڈرانے والے (یعنی پیغمبر) کو بھیج دیتے (لیکن ہم نے ایسا نہ کر کے ایک ایسا کلام نازل کیا جو تمام علوم و معارف کا جامع ہے)۔ لہٰذا تو

[54] تفسیر کبیر، از امام رازی (م ۶۰۶ھ) ۱۶/۱۳۴ - ۱۳۵، مطبوعہ طہران

کافروں کی بات (کسی بھی فکری و تہذیبی معاملے میں) مت مان۔ بلکہ اس (قرآن) کے ذریعہ (یعنی اُس کے حقائق و معارف کے ذریعہ) کافروں سے زور دار طریقے سے جہاد کر۔ (فرقان: ۵۱-۵۲)

یہ مکی سورت ہے جس میں کافروں کے ساتھ حجت و بیان اور تبلیغِ قرآن کے ذریعہ جہاد کا حکم دیا گیا ہے۔ اسی طرح منافقین کے ساتھ جہاد کا بھی حال ہے، جو دلیل و حجت پہنچانے کا نام ہے۔ کیونکہ وہ اسلام کے غلبہ کے تحت رہتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ: اے نبی تم کافروں اور منافقوں سے جہاد کرو اور اُن کے ساتھ سختی سے پیش آؤ۔ (توبہ: ۷۳)

تو منافقین کا جہاد کفار کے جہاد سے زیادہ مشکل ہے۔ اور وہ اُمت کے خواص اور انبیاء کے وارثین کا جہاد ہے۔ اور دُنیا میں اس کو قائم کرنے والے، اس میں شرکت کرنے والے اور اس میں تعاون کرنے والے چند ہی افراد ہوتے ہیں۔ اگرچہ ایسے لوگ تعداد کے لحاظ سے تھوڑے ہوں مگر وہ اللہ کے نزدیک عظیم مرتبے والے ہوں گے۔

علامہ موصوف کی اصل عبارت ملاحظہ ہو:

وأمره الله تعالى بالجهاد من حين بعثه، وقال: (وَلَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِي كُلِّ قَرْيَةٍ نَذِيراً۔ فَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ وَجَاهِدْهُمْ بِهِ جِهَاداً كَبِيراً۔) فهذه سورة مكية، أمر فيها بجهاد الكفار بالحجة والبيان وتبليغ القرآن۔ وكذلك جهاد المنافقين، انما هو بتبليغ الحجة، وإلاَّ فهم تحت قهر أهل الاسلام۔ قال تعالى: (يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ) فجهاد المنافقين أصعبُ من جهاد الكفار۔ وهو جهاد خواص الأمة وورثة الرسل۔ والقائمون به أفرادٌ في العالم۔ والمشاركون فيه والمعاونون عليه وإن كانوا هم الأقلين عدداً، فهم الأعظمون عند الله قدراً۔[55]

---

[55] زاد المعاد (تحقیق شعیب الأرنؤوط) ۳/۵، مؤسسة الرسالة بیروت، دسواں ایڈیشن ۱۴۰۵ھ/۱۹۸۵ء

(جاری)